اُردو ادب میں ہجرت اور ناسٹیلجیا

Migration and Nostalgia in the Urdu literature

نوشین نصراللہ
سکالر (پی ایچ ڈی اردو) یونیورسٹی آف ایجوکیشن لوئرمال کیمپس لاہور

Abstract

Man travels sometimes for personal reasons and at times for his nation in his lifetime. In this case he leaves his home and country but the memories related to his country and home do not leave him. Man expresses them in one way or the other. The Urdu scholars and poets who had gone through this painful phase, have expressed this feeling in their creations. After the creation of Pakistan the scholars and poets who left their home, friends, parents and other relatives and came to Pakistan could not get rid of the pain of migration and beautiful memories of the past. The literature they created after coming here contains a deep mark of migration and nostalgia.

خلاصہ

انسان کو زندگی میں کبھی ذاتی مقاصد اور کبھی اپنے ملک اور قوم کےلیے سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں اسے اپنا گھر اور ملک بھی چھوڑنا پڑتا ہے لیکن اپنے ملک اور گھر سے وابستہ یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں ۔ انسان کسی نہ کسی ذریعے سے اس کا اظہار کرتا رہتا ہے۔اردو کے ادیب اور شاعر جن کو اس جاں گداز مرحلے سے گزرنا پڑا انہوں نے اپنی اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے۔قیام پاکستان کے وقت جو ادیب اور شاعر اپنا گھر بار ، دوست احباب، ماں باپ، اور دیگر رشتہ داروں کو چھوڑ کر پاکستان آئے وہ لوگ اپنی آخری عمر تک ہجرت کے کرب اور ماضی کی خوبصورت یادوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکے۔ یہاں آکر انہوں نے جو ادب تخلیق کیا اس پر ہجرت اور ناسٹیلجیا کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

ہجرت کے لغوی معنی ہیں روانگی، کوچ، وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنا، پیغمبر خداﷺ کا مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ جانا۔ لفظ ''ہجرت'' سامی زبانوں میں ایک دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ یہ لفظ ''ہجر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی حبشی اور بعض دیگر سامی زبانوں بلکہ خود عربی میں شہر کے ہیں۔ لسان العرب میں ایک قدیم لغت نویس الازہری کے حوالے سے لکھا ہے؟

> '' الازہری کا بیان ہے کہ عربوں کے نزدیک اصل میں ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی خانہ بدوش صحرا نشین (بدوی) اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔) ''(۱)

سب سے پہلی ہجرت حضرت آدمؑ نے کی جب ان کو ان کے وطن جنت سے نکال کر زمین کی طرف بھیج دیا گیا۔ دنیا میں پہلی عظیم ہجرت حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم نے کی۔ اسی طرح اور انبیاءؑ کے ہاں بھی ہمیں ہجرت کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے بھی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپؐ نے اسلام کے ابتدائی دور میں کفار کی زیادتیوں کے پیش نظر مسلمانوں کو کوہ حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تھا۔ تاکہ وہ کفار کی تکلیفوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ سورۃ النسا میں ہجرت کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ:

> پوچھیں گے ان سے فرشتے تم کیا کرتے رہے وہ کہیں گے تھے ہم کمزور اور بے بس اپنی زمین میں، فرشتے کہیں گے کیا نہیں تھی اللہ کی زمین وسیع کہ ہجرت کر جائے تم اس میں۔''

(۲) پھر سورۃ التوبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے وہ بڑے ہیں درجہ کے لحاظ سے اللہ کے ہاں''

(۳) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ نے صرف اپنے بندوں کو ہجرت کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کو نیک بشارتیں بھی دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے اندر انسان کے لیے خیر اور فلاح رکھی ہے۔ ہجرت کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ ہجرت انبیاءؑ کی سنت ہے اور ہجرت کا مقصد کسی بڑے انقلاب کو لانا ہوتا ہے اور ہجرت کے بغیر یہ انقلاب ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ تجارت اور ہوس ملک گیری کے لیے بھی ہجرت کرتے ہیں تاکہ اپنے سے کمزور ممالک کو اپنا مطیع و فرماں بردار بناسکیں تاریخ ایسی مثالوں سے بری پڑی ہے۔ ایسی ہی تاریک کے اوراق میں ایک مثال انگریزوں کی ہے جو امریکہ سے ہجرت کرکے تجارت کی غرض سے ہندستان میں آئے اور رفتہ رفتہ یہاں پر اپنی کالونیاں قائم کیں اور پھر یہاں کے بادشاہ سے تخت و تاج چھین کر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان ایک ملک تھا لوگوں کے درمیان بھائی چارے کی فضا قائم تھی صدیوں سے ہندو اور مسلمان اکٹھے ایک جگہ پر قیام پذیر تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ میں شریک ہونے والے، ایک دوسرے کی عزت و ناموس کا خیال رکھنے والے لیکن پھر انگریز نے ''لڑو اور حکومت کرو'' کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کر دیا۔ قیام پاکستان کا عمل طویل سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے غلط تقسیم کاری کرکے ایک وسیع پیمانے پرہندوستان اور مسلمانوں کے درمیان آگ اور خون کی نہ ختم ہونے والی جنگ چھیڑ دی۔

ہندوستان کی تقسیم اور ہجرت کا عمل باقی ہجرتوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس زمین کی تقسیم اور جبری ہجرت کا فیصلہ اور اس فیصلے پر چند گھنٹوں میں عمل درآمد کیا گیا۔ یہ ایک ایسی ہجرت تھی جس کے لیے نہ اس وقت ذہنی طور پر عوام تیار تھے اور نہ ہی سرکاری عملہ ہجرت ایک کڑا مرحلہ ہوتا ہے لیکن پاک و ہند کی جانب کی جانے والی اس دہشت ناک ہجرت کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہونے کے دعویدار تھے وہی لوگ ہندو مسلم میں بٹ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔

ہندوؤں نے سکھوں کو اپنا حامی بنانے کے لیے ان کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی باندھ دی کہ آپ کو ہم مسلم اکثریت والے علاقے عطا کر دیں گے اگر وہ ان علاقوں سے مسلمانوں کو نکال دیں تو۔ اور وہ اس ہوس میں بالکل اندھے ہو کر رہ گئے۔ ''راج کرے گا خالصہ'' کے نشے میں مخمور ہو کر وہ انسانیت کی تمام حدوں کو پار کر چکے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو ان علاقوں سے نکالنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ کار استعمال کیا سکھوں نے ہندوؤں کے فریب میں آکر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر ظلم اور بربریت کے پہاڑ توڑ دیئے اور انگریز گورنر کی تحریک پر تین دن کے اندر اندر پنجاب کو مسلمانوں سے خالی کرالیا گیا۔

ملک کی یہ تقسیم غیر منصفانہ تھی۔ اور اس تلخ حقیت سے ہندو اور انگریز دونوں آشنا تھے بلکہ درحقیقت ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر یہ تقسیم پاکستان کو کمزور اور غیر مستحکم بنانے کے لیے کی تھی ورنہ مسلم اکثریت والے علاقے گورداس پور، بٹالہ، فیروز پور اور جالندھر ہندوستان میں شامل نہ کیے جاتے۔ ریڈ کلف کی بددیانتی کی وجہ سے ہی پاکستان کا تنازعہ کشمیر اور تنازہ نہری پانی جیسے مسائل پیدا ہوگئے اور افسوس تو یہ ہے کہ ساری تقسیم جانتے ہوئے بھی مسلمانوں کو یہ تقسیم قبول کرنا پڑی کیوں کہ بقول قائداعظم:

"یہ عادلانہ فیصلہ نہ ہو، بلکہ سیاسی فیصلہ ہو، بہر حال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم پر اس کی پابندی واجب ہے۔ "(۴)

ملک کی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی پورا براعظم ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ کلکتہ، نواکھلی، بہار اور دہلی میں خوفناک فسادات ہونے لگے۔ لاکھوں افراد قتل کئے گئے۔ ہزاروں عصمتیں آزادی کی بھینٹ چڑھیں، معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا، ماؤں کی گودیں اجاڑ دی گئیں، سہاگنوں کے سہاگ چھین لئے گئے، بوڑھوں اور اپاہجوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ چشم فلک نے ایسے ہولناک مناظر دیکھنے جن کا ذکر سن کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور سوا کروڑ مسلمانوں کو زبردستی پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ساتھ دیگر معاملات میں بھی ناانصافی برتی گئی۔ فوج کی تقسیم میں بھی جانب داری کی گئی۔

جنگ میں استعمال کیے جانے والا سامان بھی ہندوؤں کو دیاگیا۔ جو اثاثے تقسیم کیے گئے وہ بھی غیر منصفانہ طریقے سے پاکستان میں جو کچھ بحری بیڑے کے نام سے آیا وہ بحری بیڑا نہ تھا اور جو کچھ فضائی بیڑے کے نام سے آیا وہ فضائی بیڑا نہ تھا۔ اسی طرح جو اسلحہ پاکستان کو ملنا تھا وہ بھارتی فوج نے امن و امان کی صورت کو قائم رکھنے کے لئے تحویل میں لے لیا لہٰذا آرمی جو پاکستان فوج کے نام پر حصے میں آئے لیکن اسلحہ نہیں۔ باؤنڈری کمیشن میں بندیلی کے نتیجے میں مسلمانوں کے صنعتی علاقے بھی ہندوستان میں شامل ہو گئے۔ اور مسلمان بالکل خالی ہاتھ ہو گئے۔ ہندوؤں نے پاکستان سے اپنے تمام اہل کاروں کو پہلے ہی وہاں منتقل کر لیا تھا تمام مشینری بھی غائب کر لی گئی تھی اور دفاتر میں جو کچھ مشینری برائے نام تھی جاتے جاتے ہندو اہل کار اس کو بھی ناکارہ بنا گئے۔

مسلمان اپنی عزت جان، مال، آبرو اور اپنے پیاروں سے تو محروم ہوئے ہی تھے لیکن جب وہ لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے سرزمین پاکستان پر وارد ہوئے تو یہاں پر بھی بے شمار مسائل ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اس طرح مسلمان اپنے ملک میں جس سکھ اور سکون کی امید لے کر آئے تھے اس پر پانی پھیر گیا۔ اور مہاجرین ایک بار پھر نئے مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ دوسری طرف جو ہندوں یہاں سے ہندوستان منتقل ہوئے ان کے گھر بار اور دیگر املاک پر یہاں پر پہلے سے موجود مسلمانوں نے دھاوا بول کر اپنی مالی حالت کو بہتر بنا لیا۔ انہوں نے یہ ایک پل کے لیے بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ یہ ان لٹے پٹے لوگوں کے جینے کی ایک امید ہے۔ بجائے اس کے یہاں کے لوگ ان کے لیے رہائش اور روزگار کا انتظام کرتے۔ تقسیم ہند کے دوران ہونے والے فسادات کے نتیجے میں جہاں مسلمانوں کو بہت ساری قربانیاں دینی پڑیں وہاں زندہ رہنے والوں کو بھی اپنے صدیوں پرانے ساتھیوں اور اپنے قیمتی اثاثوں کو چھوڑنا پڑا۔ جب وہ ہجرت کرکے نئے ملک میں آئے تو یہاں بھی غربت و افلاس نے ان کے زخموں پر نمک چھڑکا۔ اس ہجرت نے ان لوگوں کے اندر ایسی توڑ پھوڑ مچائی جو آخری سانس تک ان کے ساتھ ہی رہی۔ شاعروں نے بھی اپنی شاعری میں ہجرت اور مسافرت کے دکھ بیان کیے ہیں۔ بقول میر تقی میر:

کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکارکے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

ہم بھی رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سکھوں اور ہندوؤں کے ظالمانہ سلوک کی وجہ سے مسلمانوں نے ہجرت تو کر لی اپنی صدیوں پرانی مٹی کو خیرآباد کہہ دیا لیکن وہ لوگ اس کے ساتھ ہی ناسٹیلجیا کا شکار ہو گئے۔ ناسٹیلجیا پر بات کرنے سے پہلے ہم مختصراً ناسٹلجیا کا تعارف بیان کر دیتے ہیں۔ ناسٹیلجیا کے معنی ہیں، گھر کو لوٹ جانے کی شدید خواہش، ماضی سے رغبت، وطن سے دوری لفظ ناسٹلیجیا دو یونانی الفاظ کا مرکب ہے (i) Nostos (ii) Algos

''Nostosجس کا مطلب ہے واپس گھر کی جانب لوٹنا اور Algos جس کا مطلب ہے کرب یا درد جو کہ ایک شخص (جو ذہنی طور پر مایوس ہو) کے احساسات کی جانب اشارہ کرتی ہے جو اپنی آبائی سرزمین کی جانب واپس لوٹنا تو چاہتا ہے مگر دلی طور پر اس خدشے یا واہمے کا شکار ہے کہ شاید اسے وہ سرزمین دوبارہ نصیب نہ ہو سکے'' (۵)

مختلف ماہرین اور لغات نے ناسٹیلجیاکی مختلف طرح سے جو تعریف کی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

''یعنی ناسٹیلجیاگرائمر کے اس سبق کی مانند ہے جس میں آپ حال مطلق میں تو ہوتے ہیں مگر ماضی مکمل کی صورت میں۔'' (۶)

''ناسٹیلجیاماضی کی وہ حسین یادیں ہیں جن کے خوشگوار احساس سے متعلق سوچنا آپ کے اندر مسرت و شادمانی کے لمحات پیدا کر دیتا ہے اور آپ ان یادوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔'' (۷)

ہسپل کے مطابق:

''یعنی ناسٹلیجیا حقیقت سے کہیں آگے کی صورت ہے۔'' (۸)

یش کے مطابق:

''ناسٹلیجیا دائمی مگر دھیما ور مسلسل سلگانے والا ایک ان بجھ شعلہ ہے۔'' (۹)

لونتھل کے مطابق:

''ناسٹیلجیاہمارے ماضی کی اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے جس تک رسائی ممکن نہیں۔گھر کو لوٹ جانے کی شدید خواہش ناسٹیلجیا ہے''(۱۰)

ان تعریفوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناسٹیلجیا ماضی کا رویہ ہے اور یہ کسی نہ کسی صورت میں ہر انسان کے اندر موجود رہتا ہے یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان اپنے ماضی کے ساتھ ہمیشہ جڑا رہتاہے وہ کبھی بھی اپنے ماضی سے یکسر قطع تعلقی اختیار نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کی یادوں میں ہمیشہ ایک سکون اور کشش محسوس کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ماضی میں کوئی تلخ یاد، کوئی ناخوشگوار واقعہ موجود نہ ہو لیکن چونکہ وہ اس حالت سے اس تکلیف سے گزرچکا ہوتا ہے اس لیے وہ محسوس کرتا ہے کہ موجودہ حالت پچھلی حالت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور اس حالت کو یاد کرکے وہ پر سکون ہوجاتا ہے۔ عموماً بڑھاپے میں جاکر لوگ زیادہ ناسٹیلجیا کا شکار ہوجاتے ہیں اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اپنے عہد شباب کا پرکشش وقت گزار چکے ہوتے ہیں اس لیے ہمیشہ وہ اپنے اس گزرے وقت کی یادوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ اردو ادب میں ناسٹیلجیا کی روایت انگریزی سے آئی ہے۔

اردو ادب میں ناول، افسانے اور شاعری کی اصناف سخن میں بھی ہمیں ناسٹیلجیا کے اثرات جابجا بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بالخصوص وہ ادب جو تقسیم ہند کے بعد تحریر کیا گیا ہے اس میں ناسٹیلجیا کے بہت گہرے اثرات جھلکتے ہیں۔ ابتدائی نقوش ناسٹیلجیاکے ہمیں، شرر اور مرزا ہادی رسوا کے ہاں نظر آتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول امرا و جان ادا بالخصوص اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔

''دل امنڈ چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے اس میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے انہیں دیکھا ہے۔ شب منانے کے لیے میں قناتوں سے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع اور کچھ ہو گئی تھی اس سے خیال ہوا شاید وہ جگہ نہ ہو ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا دل کو یقین ہو گیا کہ

یہی میرا مکان ہے جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر
کرو، وہ گلے لگا لیں گی مگر جرات نہ ہوئی تھی۔'' (۱۱)

یہ تو ابتدائی نمونہ تھا ناسٹیلجیا کے ناول کے اندر ناسٹیلجیا کیشدید ترین اثرات اور رویے ہمیں تقسیم ہند کے بعد تحریر کیے جانے والے ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں آگ اور خون کے اس سمندر میں سے گزرنے والی نسل کی اکثریت اردو کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں طرف سے ہجرت کرکے آنے والوں کی مادری زبان اردو تھی۔ ادیب اور شاعر معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں انہوں نے جو آگ، خون، بربریت، درندگی، سفاکیت، ظلم اور وحشیت کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے وہ ان کی تحریروں کا بھی حصہ بن گئے اور انہوں نے ان تمام مناظر کو الفاظ میں بیان کرکے ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ اس وقت کے ہر ادیب اور شاعر نے جو بھی لکھا اس کے اندر ہجرت کا دکھ ایک ناسور کی طرح ہمیں نظر آتا ہے۔ صدیوں سے لوگ جس سر زمین کے ساتھ جڑے ہوئے تھے جب ان کا اس مٹی سے رشتہ ختم کیا گیا تو وہ دکھ ان کے لیے ایک ناسٹیلجیابن گیا کیونکہ اس دھرتی کے ساتھ ان کے دکھ، سکھ، غم، خوشیاں، بچپن، یادیں، جوانی، والدین، بہن، بھائی، ہمسائے، رشتے ناطے سب کچھ وابستہ تھا اس مٹی کے ساتھ رشتہ توڑنا آسان نہ تھا یہی سبب تھا کہ وہ لوگ جسمانی طور پر تو اس مٹی سے اٹھ آئے لیکن ذہنی طور پر وہ اپنے اسی ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھے رہے اردو ادب میں فکر تونسوی کا ناول ''چھٹا دریا'' کے اندر بھی ہمیں ناسٹلجیک رویے اور ہجرت کا رنگ جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

''چھٹا دریا'' بربریت اور وحشیانہ ہندو مسلم فسادات کے تناظر میں لکھا گیا ناول ہے جس میں مصنف نے بہت ہی دکھ اور کرب کے ساتھ ایک طرف دنیا کے مہذب معاشروں کی نوبہ نو ترقی کی حالت کو بیان کیا ہے اور دوسری طرف یہی مہذب دنیا لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہی ہے اور دریاؤں کو بانٹ رہی ہے اور پنجاب میں ایک کروڑ انسانوں کو اپنے گھروں، کھیتوں، باغوں، گلیوں، محبتوں، نفرتوں، جلنے، کڑھنے اور کٹنے کے لیے تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ فکر اور ان کے دوستوں کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ آگ اتنی بھڑکائی جائے گی کہ ہر طرف دھویں کے سیاہ بادلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آئے گا اور اس دھویں میں دم گھٹنے سے انسان ہلاک ہو جائے گا ہر طرف لاشوں کے ڈھیر ہوں گے اور ننگی انسانیت اپنی بربادی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔ امرتسر سے مسلمان مجروحین اور ان کی لاشوں کو ریلوں اور لڑکوں میں بھر کر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے عصمت دری کی جانے والی عورتوں کے نڈھال چہرے اور ویران آنکھوں کو دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فکر نے ہر مسلمان، سکھ اور ہندو کے زخموں کو اپنے سینے پر محسوس کیا تھا۔ اس گناہ پر ایسے شرمندگی محسوس کرتے جیسے یہ گناہ ان سے سرزد ہواہو وہ تمام عمر اس سارے حادثے پر شرمدنہ رہے اور ''چھٹا دریا'' ان کی اس حساسیت کا تمام عمر گواہ رہے گا۔

نسیم حجازی کا ناول ''خاک اور خون'' اردو ادب کا ناقابل فراموش ناول ہے نسیم حجازی نے اس ناول کے اندر پوری تاریخ کی منظر کشی کرکے ہمارے سامنے رکھ دی ہے کہ کس طرح بھارت نے تقسیم کے عمل اور پاکستان کے قیام کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ حکمرانوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ ایسے ناسازگار حالات پیدا کردیں کہ سب کچھ نیست و نابود ہو جائے صحفہ ہستی سے پاکستان کا وجود مٹ جائے اور اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ اسی حکایت خونچان کو نسیم حجازی نے اپنے اس ناول میں پیش کیا ہے۔

اس ناول کو پڑھنے والوں کے دلوں میں 1947ء کی ہولناکیوں کی یاد ہمیشہ تازہ ہوتی رہے گی اور وہ اس خط زمین کی قدرو قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں گے جو لازوال قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ یہ ناول اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ نسیم حجازی کی بصیرت نے قوم کو جن خطرات سے خبردار کیا تھا وہ پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

نسیم حجازی کا ناول خاک اور خون بنیادی طور پر چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مسکراہٹین کے عنوان سے ہے۔ دوسرا حصہ دھڑکنیں، تیسرا حصہ سرخ لکیر (نیا دریا) اور چوتھا حصہ اے قوم کے عنوان سے ہے۔ ناول کا دوسرا حصہ دھڑکنیں کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں مصنف نے ہمار ہندی نیشنل ازم آل انڈیا کانگرس کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آیا۔ اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منوجی کے وان آشرم سے مختلف نہ تھے۔ گاندھی اور منوجی کا کام کا ایک ہی طریقہ تھا گاندھی کو خطرہ تھا کہ جس قوم کو نیست و نابود کرنے کا ذمہ اس کے دیوتاؤں نے اس کو

سونپا ہے۔ وہ سو رہی ہے مر نہیں رہی ہے۔ اس لیے اس کو بے ہوشی کے ٹیکے لگانا بے حد ضروری ہیں۔ گاندھی جی کی آتما نے کئی چولے بدلے لیکن مسلمانوں کے متعلق ان کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نیہں آئی۔ تاہم آزادی کے نعروں میں کچھ ایسی کشش موجود تھی کہ مسلم عوام کا جوش و خروش ابھی تک کانگرس کے ساتھ تھا۔ مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب حالات نے ثابت کر دیا کہ کانگریس جیسے آزادی کہتی تھی وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا۔

کالج میں دو گروپ تھے ایک الطاف گروپ اور ایک اختر گروپ الطاف گروپ متحدہ ہندوستان کا حامی تھا لیکن اختر گروپ ایک الگ ملک پاکستان کا۔ دونوں گروپس میں گرما گرم مباحثے ہوتے رہتے تھے پاکستان کے حق میں ایک گروپ دلیلیں دیتا تو دوسرا گروپ متحدہ ہندوستان پر زور دیتا تھا۔ ناول کا تیسرا حصہ سرخ لیکر (نیا دریا) کے عنوان سے تھے۔ اس حصے کے آغاز میں مصنف نے سلیم کی منگنی کے منظر کو بیان کیا ہے۔ سلیم کی منگنی ڈاکٹر شوکت کی بیٹی عصمت سے ہوتی ہے۔ گھر کی خواتین سلیم کی ادی کو تنگ کرنے کے لیے کہتی ہے کہ سلیم اس رشتے کے لیے نہیں مانتا اور وہ لاہور میں کسی میم سے شادی کرے گا دادی سب کو برا بھلا کہتی ہے سلیم کے کان کھینچتی ہیں پھر صغریٰ کی دادی کے ہاتھوں پٹائی ہوتی ہے۔ سلیم کی دادی دو ہفتے کے اندر شادی کرنا چاہتی ہے لیکن عصمت کی ماں کہتی ہے کہ پاکستان کا فیصلہ ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب سلیم کے ابا سے مل کر کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔ سلیم کے گاؤں میں امن کمیٹی قائم ہو چکی ہے جس میں علاقے کے نامور سکھ، مسلمان اور ہندو جمع ہیں۔ سیٹھ رام لال نے تقریر کرتے ہوئے علاقے کا امن و امان قائم رکھنے کے لئے کوشش کرنے والے افراد کو سراہا۔ ریڈیو پر باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا اعلان سنایا جاچکا تھا۔ ضلع گورداس پور پاکستان کی بجائے ہندوستان کو دیا جاچکا تھا۔ یہ اعلان مسلمانوں کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گرا۔ مہندر سنگھ کے گاؤں کے اسی باغ میں پھر جلسہ ہورہا تھا جس میں برچھیوں اور کرپانوں سے مسلح ایک ہزار افراد موجود تھے اور ان سب کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ چودھری رحمت علی کے گاؤں کو ختم کرنا تھا اور اس کے گھر کی عورتوں کی ڈولیاں اٹھانے تھا سکھ، بلوتناسنگھ کی تجویز کے مطابق دو حصوں میں منقسم ہو کر آگے بڑھ رہے تھے اور ان کا رخ چودھری رحمت علی کے گھر کی طرف تھا جہاں اور بہت قریبی دیہاتوں کے مسلمان بھی جمع ہو چکے تے۔ یہاں پر موجود لوگوں نے آخری سانس تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سکھوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کو یہاں پر اتنی زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ سکھوں کو برین کریر سے حملہ کرنا پڑے گا۔ سلیم اور مجید نے آخری وقت تک اپنے گھر والوں کی حفاظت کی لیکن وہ کسی کو بھی نہ بچا سکے سب جل کر راکھ ہو گیا۔ رات کے دو بجے سلیم اور اس کے ساتھی گاؤں سے کوچ کرنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ راستے میں ان کے ساتھ پاکستان کا رخ کرنے والے پناہ گزینوں کی ٹولیاں شامل ہوتی گئیں۔ راستے میں سلیم کو چند نہتے سپاہی مل گئے اور اس نے فالتو رائفلیں ان میں تقسیم کر دیں۔ راستے میں ارشد کا گاؤں بھی آیا اور وہ بھی جل رہا تھا۔ سب کچھ خاکستر ہو رہا تھا اور اس میں زندہ بج جانے والوں میں ڈاکٹر اور ان کی دو بیٹیاں تھیں ان کا بڑا بیٹا ارشد ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اس ناول میں ہمیں ناسٹیلجیاکے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

> ”سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور تھکی ہوئی آواز میں کہا مجید! مجھے تنگ نہ کرو میں ابھی سوہا ہوں چچی جان! مجید کو منع کرو۔“ (۱۲)

مشرقی پنجاب میں وحشت و بربریت کا سیلاب پھیلتا گیا مسلمان اس قیامت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

> ”تھوڑی دیر بعد وہ سورہا تھا نیند کی حالت میں وقت اور بھلا کے پردوں کو اٹھاتا ہوا شاہراہ حیات کے اس کنار پہنچ چکا تھا جہاں ماضی کی مسکراہیٹیں دفن تھیں وہ دادو، مجید، جلادل اور بشیر کے ساتھ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں کھیل رہا تھا وہ ان کے ساتھ درختوں میں پرندوں کے گھونسلے تلاش کر رہا تھا وہ چمکتے ہوئے پروں والے موروں کے پیچھے بھاگ رہا تھا وہ رنگا رنگ کے پھلوں کے گل دستے بنا رہا تھا پھر وہ اپنے خاندان کے بچوں کے ساتھ جھولا جھول رہا تھا گھر کی عورتوں کے درمیان بیٹھا انہیں کہانیاں سنا رہا تھا۔ آخر یہ منظرقوس قزح کے رنگوں کی طرح روپوش ہوتے گئے پرھ وہ چچا اسماعیل کے قہقہے سننے لگا۔ یہ خوش گوار قہقہے بلند اور لہب ہوتے گئے۔ اسماعیل کے ارد گرد اچانک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ شعلے بلند ہوتے گئے اب اس کے ارد گرد سینکڑوں مرد

عورتیں اور بچے قہقے لگا رہے تھے آگ کے شعلوں نے انہیں چھپا لیا لیکن قہقہے اسی طرح سنائی دیتے رہے۔"(۱۳)

خدیجہ مستور کا تحریر کیا گیا ناول "آنگن" ہجرت کے موضوع پر ایک خوبصورت ناول ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے یوپی کے ایک مسلمان گھرانے کی صورت حال کو پیش کیا ہے کہ کس طرح اس وقت کے سیاسی نظریات لوگوں کو زندگی پر کس طرح اثرا انداز ہورہے تھے۔ گھر میں مختلف سیاسی نظریات سے تعلق رکھنے والے افراد تھے جس کی وجہ سے "آنگن" مختلف سیاسی نظریات کا اکھاڑا بنا رہتا ہے۔

ناول کے پہلے حصے میں مصنفہ نے عالیہ کے ماضی کو پیش کیا ہے۔ عالیہ اپنی یادوں کے روزن کھول کر اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانکتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے باپ کے ساتھ ایک سرکاری کواٹر میں رہتی تھی اور ان کا پکی اینٹوں سے بنا ہوا مکان تھا جہاں پر ان کے ساتھ ان کی پھوپھی سلمہ کا بیٹا صفدر بھی رہتا تھا۔ صفدر کو عالیہ کی ماں بالکل اچھا نہیں سمجھتی تھی کیونکہ سلمہ پھوپھی نے بھاگ کر ایک غریب کسان کے بیٹے سے شادی کرلی تھی اسی باعث سارے خاندان نے ان کے ساتھ رشتہ توڑ لیا تھا۔ اور بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئیں تھیں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئیں تھیں۔ بہن کی وفات کے بعد عالیہ کا باپ صفدر کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ صفدر عالیہ کی بہن تہمینہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس کی ماں نے اس کی شادی بڑے چچا کے بیٹے جمیل سے طے کر دی تھی اور شادی سے کچھ روز قبل خود کشی کرلیتی ہے۔ اسی طرح کسم دیدی جس سے عالیہ بہت محبت کرتی تھی کم سنی میں کسم دیدی ویدوا ہو جاتی ہیں اور ان پر رنگین کپڑے پہننا ممنوع ہو جاتا ہے تو کسم دیدی بھاگ جاتی ہیں لیکن بعد میں ان کا عاشق ان کو چھوڑ کر بھاگ گیا ور کسم دیدی نے خود کشی کر لی۔ ان ہی دنوں میں عالیہ کے باپ کا جھگڑا ایک انگریزآفیسر سے ہو گیا اور وہ جیل میں چلا جاتا ہے اور عالیہ اپنی ماں کے ساتھ بڑے چچا کے گھر آجاتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ بڑے چچا کٹر کانگرسی تھے اور ان کا بیٹا جمیل مسلم لیگی تھا۔ دونوں باپ بیٹے میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی دونوں پر وقت ایک دوسرے سے بیزار رہتے تھے۔ اسی گھر میں چھمی بھی رہتی تھی وہ بھی مسلم لیگی تھی اور بڑے چچا کے خلاف بچوں کو اکھٹے کرکے مسلم لیگ کے جلوس نکالتی تھی۔ چچا کے گھر پر جاگیر دار گھرانے کی خوشحالی ختم ہو چکی تھی چچا اپنا سارا روپیہ سیاست کے نذر کرتے جارہے تھے۔ گھر میں بدحالی بڑھتی جارہی تھی گھر کی ملازمہ کریمن بوا اکثر گھر کی خوشحالی کے وقت کو یاد کرکے نوسٹلجیک ہوتی ہیں۔

"جاڑوں میں یہی اس تخت پر بیٹھے بیٹھے سب لوگ مٹھیاں بھر بھر کر ریوڑیاں کھایاکرتے تھے۔ اپنا تو منہ تھک جاتا تھا چباتے چباتے اب تو جاڑے یوں ہی گزر جاتے ہیں مگر ایک ریوڑی نصیب نہیں ہوتی واہ رے زمانے۔" (۱۴)

ناول کا دوسرا حصہ ہجرت کے المیہ پر مشتمل ہے۔ ہر طرف فسادات کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اور بڑے چچا یہ سب دیکھ دیکھ کر انتہائی پریشان ہوتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے ہندو اور مسلمانوں کا آپس کا بھائی چارا کیسے ختم ہو گیا ہے کیسے ایک دوسرے پر جان دینے والے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ جمیل بھیا ان دنوں بڑے پرجوش ہوتے ہیں کہ کانگریسی جتنے بھی روڑے اٹکا لیں وہ اب کچھ نہیں کر سکتے پاکستان ایک اٹل حقیقت ہے جس کو اب کسی بھی صورت میں نہیں ٹالا جاسکتا۔

"تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟ بڑی چچی نے پوچھا

واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی جو جہاں ہے وہیں رہے گا مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاو

ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ

جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لی

ہاں جمیل میاں یہ جانے والے کی بات بری ہے میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ کریمن بوا بھی آخر بول ہی پڑیں۔" (۱۵)

انہیں فسادات کے دنوں میں عالیہ کے ماموں نے خط لکھ بھیجا کہ ہم سب پاکستان جا رہے ہیں۔ آپ بھی تیاری کر لو اماں جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ جمیل بھیا نے چچی اور عالیہ کو روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ کسی بھی طرح کامیاب نہ ہوپایا اور آخر کار عالیہ ماموں کو تار دے دیا۔

''کون جارہا ہے پاکستان؟ بڑے چچا صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچا انہوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں کیا تم سچ مچ جارہی ہو بیٹی؟

ہاں بڑے چچا اماں جو تیار ہیں اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا۔'' (۱۶)

عالیہ اور اس کی ماں پاکستان جاتے ہیں۔ بڑے چچا کو کسی کانگرسی نے قتل کر ڈالا تھا۔ جمیل بھیا کی شادی چھمی سے ہا جاتی ہے گھر میں خوشحالی آجاتی ہے۔ عالیہ اپنا وقت سکول اور والٹن کیمپ میں گزار تی ہے اور زندگی کے بے کیف دن گزار رہی ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' بھی ہجرت، فسادات اور نوسٹیلجیا کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مصنف پنجاب کے ایک قصبے روشن پور کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے تقسیم وطن تک کے واقعات ہیں۔ ناولوں میں تاریخ کے مختلف ادوار کو کھولا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کس طرح شروں اور دیہاتوں پر اپنے مخصوص اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ اس ناول میں تین ادوار کو پیش کیا گیا ہے پہلا دور برطانوی حکومت کا ہے۔ دوسرا دور جدوجہد آزادی کا زمانہ اور تیسرا دور تقسیم ہند کا دور ہے۔ اداس نسلیں پنجاب کے کسانوں پر کیا جانے والا ظلم و ستم، جاگیردار قوتوں کا جبر و استحصال پسندی، کارخانوں میں خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کی محرومیاں اور نا آسودگیاں شہروں میں بسنے و الے لوگوں کے مزاج، دوسری جنگ عظیم میں زبردستی لوگوں کی فوج میں بھرتیاں وغیرہ کا ذکر ہے۔ پریم چند کی طرح عبداللہ حسین نے بھی اپنے ناول میں گاؤں کے مناظر اور کرداروں کو بیان کیا ہے۔

نعیم اس ناول کا مرکزی کردا ر ہے جو روشن پور کے ایک خوشحال کسان کا بیٹا ہے۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں شرکت کرتا ہے اور وکٹوریا کراس حاصل کرتا ہے اور روشن آغا کی بیٹی عذرا سے شادی کر لیتا ہے اسی وجہ سے اس کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ پہلے وہ دہشت پسندوں کے گروہ میں شامل ہوتا ہے اور پھر کانگرس میں شامل ہو کر پر امن طریقے سے جدوجہد آزادی کے لیے کوشش کر دیتا ہے۔ جبکہ اس کا سوتیلا بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ ناخواندہ ہیں۔

تقسیم سے قبل جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو روشن محل کے مکین اور نعیم، علی اور عائشہ کو ہجرت کرنا پڑتی ہے روشن آغا اور ان کے خاندان کے لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان آجاتے ہیں۔ نعیم ان لوگوں کے ساتھ آنے سے انکار کر دیتا ہے بعد میں وہ جب ایک قافلے کے ساتھ ہجرت کرتا ہے تو وہ راستے میں آنے والی تکالیف اور مصائب کو براشت نہیں کرپاتا اور راستے میں ہی مارا جاتا کیونکہ روشن آغا کے خاندان کے ساتھ تعلقات جڑ جانے کے بعد وہ بہت ساری سہولیات کا عادی ہوجاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اس کا بھائی علی سخت جان ہے وہ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ جاتا ہے۔ جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو روشن آغا ہجرت کے لیے تیار نہیں تھے وہ اپنی جاگیریں اور خاندانی کوٹھیوں کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہ رہے ہوتے لیکن جب ان کی کوٹھی کو نذر آتش کر دیاجاتا ہے تو وہ ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

نعیم جس قافلے میں سفرکررہا تھا وہ قافلہ ہر روز بڑھتا جاتا تھا۔ قافلے کے تھکے ماندے اور دہشت زدہ لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں بھی پھیلتی جارہی تھیں یہ نہیں کہ کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی سے کوئی افواہ پھیلا رہا ہے بلکہ سنی سنائی باتیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتیں اور قافلے میں ایک بھگدڑ مچ جاتی۔ اس سفر میں عورتوں کا استحصال اور ان کے جسموں کی پامالی بھی عروج پر تھی۔ نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو حملہ آور اٹھا کر لے جاتے ان کے ساتھ اجتماعی بے حرمتی کرکے ان کو مرنے کے لیے بے یارو مددگار جنگل میں چھور جاتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس اناج تھا وہ بھی اس اناج کے بدلے اپنے ہی قافلے کی عورتوں سے لذت یاب ہوتے تھے۔ جو لوگ چلتے چلتے گر کر بے ہوش جاتے یا گر پڑتے یا مر جاتے تھے قافلہ ان کو چھور کر آگے بڑھتا جاتا۔ نعیم اس

قافلے کی ہر ایک حرکت کا چشم دید گواہ تھا وہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو کر نیم دیوانگی کی حالت میں سفر کر رہا تھا اور اس عظیم انسانی حادثے کا مشاہدہ کر رہا تھا جو اس ہجرت کی شکل میں رونما ہورہی تھی۔

> 'وہ سب کچھ دیکھتا بھالتا، کھاتا اور کبھی کبھی اونگھتا ہوا چل رہا تھا اس کی صورت اپنے دوسرے ہم عمروں سے قطعی مختلف نہ تھی سب کی داڑھیاں اور چہرے غلیظ لباس پھٹے ہوئے اور پاؤں سوجے ہوئے تھے سب ننگے پاؤں تھے کہ سارے جوتے تنگ ہو چکے تھے سب کی نظریں گونگی اور آوارہ تھیں اور ان سے طویل بے منزل مسافرت کی تکلیف ٹپکتی تھی، سب کے نزدیک اہم ترین کام چلتے جانا اور اکھٹے رہنا تھا اور وہ ان سب میں گھلا ملا ہوا۔ کھویا ہوا، محض ایک اور گمنام بے حیثیت مسافر تھا۔ اس کے سامنے وقفے وقفے پر حملے ہو رہے تھے، لوگ مر رہے تھے،جو مارے جانے سے بچ رہے تھے وہ تھک کر گر رہے تھے، سامان کو آگ لگائی جارہی تھی اورلوگ خوراک کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے سڑک پر اور سڑک کے کنارے لاشوں کا طویل سلسلہ تھا۔ کوئی پلیا کے پتھر کے سہارے بیٹھا تھاور کوئی درخت کے ساتھ کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ عورتوں کے ننگے مردہ جسم بے شرمی سے پھیلے ہوئے تھے۔ اور جنگلی جانور اور پرندے ان پر پل رہے تھے۔ جو زندہ تھے وہ مستقل چل رہے تھے اور میاں بیوی، بہن بھائی اور ماں اور بچے کے رشتے ختم ہو رہے تھے اور وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو دنیا کی تاریخ میں ایسے قافلوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔'' (۱۷)

یہ وہ دور تھا جب انسانیت کے ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ درندگی اور بربریت کی انتہا کو چھو رہے تھے اور زندگی کے اس موڑ پر وحشی درندوں اور چوپایوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے ناول ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے جیسے چھٹا دریا، یا خدا، میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، چاندنی بیگم، چاند گہن، بستی غدار، مٹی کے صنم، میری یادوں کے چنار، زمین، ضرار وغیرہ وغیرہ۔

انتظار حسین کا افسانہ سیڑھیاں تھی ہجرت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس میں مصنف نے تقسیم کے فوراً بعد مہاجرین کو جس صورت حال کا سامنا تھا اس کو بیان کیا گیا ہے۔ وسائل کم تھے اور مسائل زیادہ تھے۔ مسافرت، ماضی کی یاد یں، بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے دکھ، جائیدادیں، جاگیریں، خوشحالی، سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور اسی ذہنی و جذباتی حالت کو اس افسانے میں موضوع بنایا گیا ہے۔ انتظار حسین پر اس ہجرت نے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے انتظار حسین نے اس تجربے کو انفرادی، اجتماعی سطح پر محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ شاہد انتظار حسین تقسیم کو ابھی تک ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے۔ نئے آنے والے مہاجرین بدلے ہوئے حالات اور نئی جگہ کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیڑھیاں میں چار کردار ہیں، سید بشیر بھائی، رضی اور اختر یہ متوسط طبقے کے روایتی کردار ہیں جن کی روایتی ماحول میں پرورش ہوتی ہے۔ توہم پرستی، جن، چڑیل، سانپ جادو اور ضعیف الاعتقادی اس معاشرے کی اہم خصوصیات تھی۔

سید اپنے قدیم مکان اور اس کی وسعت کو یاد کرتا ہے۔ اپنے بچپن کو اور اپنی بچپن کی محبت ''بندی'' کو یاد کرکے اداس ہوتا ہے چاروں کردار ذہنی طور پر منتشر اور عدم آسودگی کا شکار ہیں۔ گفتگو خوابوں اور ان کی تعبیر سے شروع ہوتی ہے۔ اختر خواب دیکھتا ہے اور بشیر بھائی سے ان خوابوں کی تعبیر دریافت کرتا ہے اور وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ خوابوں کی تعبیریں بتاتا ہے۔ رضی کی والدہ اپنے خاندانی امام باڑے کی وجہ سے ہجرت نہیں کرتیں ہیں اور وہیں پہ رک جاتی ہیں وہ اب فوت ہو چکی ہیں اور بہت ساری مجبوریوں اور رکاوٹوں کے باعث رضی ان کی وفات پر نہیں جاسکتا ہے یہ دکھ وہ اپنے اندر چھپا کے رکھتا ہے اور اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے گفتگو کے دوران یہ دکھ اچانک اس کی زبان پر آجاتا ہے۔ اس کی آواز رندھ جاتی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں ہجرت کے اس عمل میں خاندان کس طرح تقسیم ہوئے اور دونوں طرف مقیم افراد کس ذہنی کرب کا شکار ہیں اس کی نشاندہی رضی کے انفرادی المیے سے ظاہر کی گئی ہے۔

رضی کی باتیں سننے کے بعد سید کے ذہن میں ماضی کی یادوں کا ایک دریچہ کھل جاتا ہے اور وہ ماضی پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنی زندگی کا ہر ایک زاویہ اسے ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔

''اماں جی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں زینے پر چڑھ رہا ہوں

پیغمبری خواب ہے بیٹا ترقی کرو گے! افسر بنو گے!!!

اماں جی خواب میں اگر پتنگ اڑتی دیکھئے؟

نہیں بیٹا ایسے خواب نہیں دیکھتے!

پتنگ دیکھنا اچھا نہیں بے وطنی اور پریشانی کی نشانی ہے'' (۱۸)

سید کا دوست رضی جاگتے میں خواب دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی کالی اور سفید پتنگ ہے اور وہ پتنگ کٹ کے ڈور اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اس کو پکڑنے کے لیے وہ سیڑھیاں چڑھتا ہے اور سیڑھیوں کے بعد پھر سیڑھیاں اور پھر سیڑھیاں---- کالی اور سفید پتنگ دن اور رات کی علامت ہے اور ڈور وقت کی علامت ہے اور سیڑھیاں زندگی کے سفر کی علامت ہے۔

منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' بھی ہجرت کے موضوع پر لکھا گیا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں انسانی نفسیات کی بہت خوبصورت عکاسی کی ہے کہ ہجرت نے کس طرح لوگوں کی زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیا صدیوں سے ایک جگہ پر آباد لوگوں کے لیے اپنے وطن اپنی مٹی کو چھوڑنا کس قدر دشوار تھا اور وہ کس ذہنی کرب اور ناآسودگی سے دوچار ہوئے۔ منٹو نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ تقسیم کے بعد پاگل قیدیوں کے تبادلے کا مصنوبہ سامنے آتا ہے اور اس منصوبے کے تحت ہندوستان میں موجود مسلمان قیدیوں کو پاکستان اور پاکستان کی جیلوں میں موجود ہندوستانی قیدیوں کو ان کی اپنی جیلوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

پاگل قیدیوں کو سمجھ نہیں آرہی ہوتی ہے کہ ابھی کل تک وہ ہندوستان میں تھے آج وہ پاکستان میں کیسے آگئے اور اگر وہ پاکستان میں تھے تو وہ ہندوستان میں کیسے پہنچ گئے وہ ایک دوسرے سے اس معاملے میں استفسار کرتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں ایک پاگل جس کا نام بشن سنگھ ہے وہ پندرہ سال سے پاگل خانے میں قید تھا اس کی زمینیں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہیں۔ شروع شروع میں اس کے گھر والے ہر مہینے اس سے ملنے آتے تھے لیکن اب جب سے حالات خراب ہوئے تھے کوئی اس سے ملنے نہیں آتا ہے وہ جیل میں ہر ایک سے پوچھتا رہتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے پاکستان میں یا ہندوستان میں؟ آخر کار مقررہ دن پر قیدیوں کا تبادلہ شروع ہوا قیدیوں کی اکثریت اس تبادلے پر راضی نہیں تھی کہ آخر کار ان کو اپنی زمین سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جارہا ہے جب تبادلہ شروع ہوا تو قیدیوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا کوئی گالیاں بکتا، کوئی چیخیں مارتا اور بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلا جاتا آخر کار جب بستن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا کہ یہ بتاؤ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے افسر ہنسا اور بولا پاکستان میں بشن سنگھ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا پاکستانی افسروں نے اس کو پکڑ کر پار بھیجنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ چلانے لگا زور زو رسے ''اوپڑدی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا منگ دی دال آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان'' اسے بہت سمجھایا گیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے تم چلے جاؤ فوراً ٹوبہ ٹیک سنگھ کو وہاں ہندوستان بھیج دیا جائے گا لیکن وہ نہیں مانا اور بارڈر کے درمیان جا کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ دنیا کی کوئی طاقت اب اپنی جگہ سے اس کو نہیں ہلا سکتی تھی وہ بے ضرر سا آدمی تھا اس کو چھوڑ کر باقی قیدیوں کی کارروائی شروع ہوئی انتہائی یخ بستہ سردی وہ تمام رات اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر وہاں کھڑ ارہا صبح طلوع ہونے سے پہلے ایک دردناک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ پندرہ برس تک دن رات جن ٹانگوں پر کھڑا رہا اب وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا تھا ادھر ہندوستان تھا اور ادھر پاکستان تھا اور درمیان میں جو زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پڑا تھا۔

انتظار حسین اور منٹو کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں نے بھی ہجرت کو اپنے افسانوں کو موضوع بنایا ہے جیسے کرشن چندر، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نالوں

اور افسانوں کے ساتھ ساتھ ہجرت کے المیے کو شاعری میں بھی موضوع سخن بنایا گیا اور اس حوالے سے ہمارے سامنے سب سے بڑا نام ناصر کاظمی ہے۔

ناصر کاذمی زمانے میر کے آشوب زمانہ سے مماثلت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری کی طرح ناصر کی شاعری میں بھی ہجرت کا دکھ سمیٹ آیا ہے اور ناصر اپنی اس سرزمین کو کبھی نہیں بھول پایا جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی جہاں اس نے زندگی کی خوبصورتیوں کو محسوس کیا تھا۔ جہاں اس نے پہلی بار پھولوں کو کھلتے، بارشوں کو برستے اور زندگی کے خوبصورت سازوں کو محسوس کیا تھا جب اس دھرتی سے ہجرت کرنا پڑی تو اس کا دکھ ناصر کے رگ دیے میں سما گیا اور یہ دکھ مرتے دم تک اس کے ساتھ رہا۔ ہجرت اور ہجر اس کی شاعری کا استعارہ بن گیا اور تمام عمر اس ماضی کی یاد میں نوسٹلجیک ہوتا رہا جو اب کبھی بھی پلٹ کر اس کے پاس نہیں آنے والا تھا۔ ناصر اپنے شہر انبالہ کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے

میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی (۱۹)

ناصر کی شاعری میں اداسی کا پہلو ہر طرف بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ہجرت نے ان کے اندر ایک سوگوار اداسی کی فضا پیدا کر دی ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے (۲۰)

ناصر کی غزلوں میں کھوئے ہوؤں کی جستجو اور ماضی کے خوبصورت موسموں کی بازگشت ہے۔ اور وہ ماضی کے نوحوں کو اپنی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیتے ہیں۔

وہ بھی اداس اور مری رات بھی اداس

ایسا تو وقت اے غم دوراں نہ تھا کبھی

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی

یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی۔ (۲۱)

ناصر نے ہجرت کے دوران جو تباہی و بربادی دیکھی، انسانی اقدار کی یا حالی دیکھی، اپنوں کو پرایا ہوتا دیکھا۔ خون کی بہتی ہوئی ندیاں دیکھیں عورتوں کی عصمت دری اور انسانوں کی بے حسی دیکھی۔ جلتے ہوئے گھر اور عزیوں پر لٹکتے ہوئے معصوم بچوں کے سر دیکھے۔ اور یہی تمام کیفیات ناصر کی شاعری میں موجود ہیں۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

کہا کیوں اب تمہیں خزاں والو!

جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ (۲۲)

ناصر جب لٹے ہوئے قافلوں کو دیکھتے ہیں ان کی دردناک آہ و پکار کو سنتے ہیں تو بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔

اوہ میرے مصروف خدا

اپنی دنیا دیکھ ذرا

اتنی خلقت کے ہوتے

شہروں میں ہے سناٹا
پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا۔ (۲۳)

ناصر کا کہنا ہے کہ:

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہوگئے ہیں
اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے۔(۲۴)

ناصر کاظمی کے علاوہ بھی شاعروں نے شاعری میں ہجرت جانکاہ دکھ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ان میں منیر نیازی اور احمد مشتاق کا نام سر فہرست ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، ''عہد نبوی میں نظام حکمرانی''، باب السلام پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۶۴

۲۔ قرآن حکیم (اردو ترجمہ) مترجم شبیر حسین، سید (آیت ۹۷)، لاہور، مطبوعہ ایجوکیشن ٹاؤن وحدت روڈ، ۱۹۹۹ء

۳۔ ایضاً، آیت ۲۰۔

۴۔ سمیرا، بشیر، ''اردو فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات'' (غیر مطبوعہ مقالہ) مخزونہ، لائبریری، شعبہ اردو، جامعہ کراچی، کراچی

۵۔ مسیح، اشرف، ''اردو ناول میں ناسٹیلجیا ۴۷کے بعد''، (غیر مطبوعہ مقالہ) مخزونہ، لائبریری شعبہ اردو، ایجوکیشن یونی ورسٹی لوئر مال، کیمپس، لاہور، ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۶ء۔

۶۔ ایضا، ص ۵

۷۔ ایضاً، ص ۶

۸۔ ایضاً، ص ۷

۹۔ ایضاً، ص۷

۰۱۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۲۔ حجازی، نسیم، ''خاک اور خون''، جہانگیر یکس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۰۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۱۴۔ مستور، خدیجہ، ''آنگن''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۱۷۔ حسین، عبداللہ، ''اداس نسلیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۷۱

۱۸۔ اورنگ زیب عالم گیر، ڈاکٹر، ''انتظار حسین تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، سنگت پبلشرز، ۵۲ سی لوئر مال، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱۱۲

۱۹۔ حسن رضوی، ڈاکٹر، ''وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۶

۲۰۔ ایضا، ص ۸۶

۲۱۔ ایضا، ص ۲۱۲

۲۲۔ ایضا، ص ۲۱۵

۲۳۔ ایضا، ص ۲۱۸

۲۴۔ ایضا، ص ۲۲۳